برطانیہ: بلاشبہ اک پرچم کے سائے تلے

تحریر: سہیل احمد لون

بریگزٹ ریفرنڈم کی وجہ سے برطانوی وزرائے اعظم کی گھر جانے کی ہیٹ ٹرک مکمل ہونیوالی ہے، 12 دسمبر 2019ء کو برطانیہ میں عام انتخابات ہونے جارہے ہیں۔ تمام سیاسی جماعتیں اپنے منشور کا پرچار کرکے عوامی رائے اپنے حق میں ووٹ کے زریعے کرنے میں مشغول ہیں۔ مادر جمہوریت برطانیہ میں قانون سازی کے لیے ہاؤس آف کامنز میں 650 ممبرز آف پارلیمنٹ ہیں جو عام انتخابات میں عوامی ووٹ کے ذریعے منتخب ہوتے ہیں اور ہاؤس آف لارڈز میں 818 لارڈز کو مختلف خدمات کے اعتراف میں نامزد کیا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤس میں ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز سے قانون سازی کا بل مشترکہ طور پر پاس ہونے کے بعد ملکہ برطانیہ کے پاس حتمی منظوری کے لیے بھیجا جاتا ہے جو سرکاری مہر لگا کر قانون پاس یا ترمیم ہونے کا عندیہ دیتی ہیں جس کے بعد قانون نافذ عمل ہوتا ہے۔ تعمیراتی کاموں سمیت دیگر انتظامی امور کے لیے لوکل کونسل ذمہ دار ہوتی ہے جس علاقے کے میئر کے علاوہ وارڈز کے کونسلرز شامل ہوتے ہیں۔ Devolution and Localism ہی اصل جمہوریت ہے جس میں اختیارات اور ذمہ داری کا توازن ہوتا ہے۔ سینٹرل گورنمنٹ سے لوکل کونسل کو فنڈز ملتے ہیں اور لوکل کونسل اپنے ذرائع سے بھی فنڈز اکٹھا کرکے علاقے کی بہبود کے لیے کام کرتی ہیں۔ لوکل باڈی کے انتخابات بھی جماعتی بنیادوں پر ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں ابھی تک امریکہ کی طرح کمپوٹرائز ڈ ووٹ کاسٹنگ سسٹم متعارف نہیں ہوا، بیلٹ پیپر پر ہی ووٹ دینے کا نظام چل رہا ہے جس میں بذریعہ ڈاک ووٹ ڈالنے کی سہولت بھی دی جاتی ہے مگر اس کے باوجود لوگ انتخابی نتائج کو تسلیم کرتے ہیں۔ انتخابات کے بعد منظم یا غیر منظم دھاندلی کی بین بجا کر عوام کو مست کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ 650 سیٹوں کے حصول کے لیے کوئی سیاسی جماعت ریلی نہیں نکال رہی، دیواروں کو اشتہار گاہ نہیں بنایا گیا، علاقے میں چاہے ہسپتال ایک ہی ہے مگر گراؤنڈز کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود جلسہ گاہ بنانے کا نہیں سوچا گیا، تمام سیاسی جماعتوں کے ووٹرز بھی ہیں اور سپورٹرز بھی مگر کوئی ایک دوسرے کے خلاف نعرے بازی کرتا دکھائی نہیں دیتا، ہر سیاسی جماعت کا اپنا ایک ایجنڈا تو ہے مگر کسی بھی سیاسی جماعت کا کوئی جھنڈا نہیں، شاید اسی کو ایک پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں کہتے ہیں، ظاہر ہے جہاں سیاسی جماعت کا اپنا جھنڈا ہی نہیں ہوگا تو مخالف جماعت کے سپورٹرز نہ جھنڈا جلائیں گے اور نہ ڈنڈا برسائیں گے، مذہبی اور سیاسی آزادی ہونے کے باوجود کوئی سیاسی جماعت سڑکوں پر جلوس نہیں نکال رہی، سیاسی قیادتیں ٹی۔ وی پر عوام کے سامنے مکالمہ کرتے ہیں ایک دوسرے کی ذاتیات پر کیچڑ اچھالنے کی بجائے ملکی مسائل اور ان کا بہتر حل پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ عوام ان کی طرف راغب ہوں۔ امیدوار اپنے اپنے حلقہ انتخاب میں گھر گھر جاتا ہے اور اس وقت اس کے ساتھ کوئی خوشامدی ٹولہ یا سیکورٹی کے نام پر پروٹوکول کا قافلہ بھی نہیں ہوتا، جمعہ کی نماز کے بعد مساجد کے باہر کھڑے ہوکر اپنے ہاتھوں سے اشتہارات بانٹ رہے ہوتے ہیں، سوشل میڈیا کے ذریعے بھی وہ بڑے متحرک نظر آتے ہیں۔ حیران کن طور پر انتخابات والے دن عام تعطیل کا اعلان بھی نہیں کیا جاتا، کسی سیاسی جماعت میں شخصی غلبہ نظر نہیں آتا ہر جماعت کا سربراہ قابلیت اور نظام کے تحت بنتا

ہے کسی کو وصیت میں جماعت کی قیادت کی بشارت نہیں ہوتی، موروثیت کے جراثیم سے بھی سیاست پاک نظر آتی ہے۔ لیبر پارٹی ٹریڈ یونین اور مزدور طبقہ لوگوں کے چندے پر چل رہی ہے، کنزویٹو پارٹی کی فنڈنگ بزنس مین کلاس سے ہوتی ہے، لبرل ڈیموکریٹس کی فنڈنگ ان کے کارکنان کرتے ہیں۔ الیکٹورل کمیشن کے قوانین کے مطابق £7500 سے زائد رقم کی ڈونیشن باقاعدہ طور پر ظاہر کرنا لازمی ہے گزشتہ عام انتخابات میں لبرل ڈیموکریٹس کے امیدوار ابراہیم ٹگور کو Donation scandal میں ملوث ہونے کی وجہ سے پارٹی سے نکال دیا گیا اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے ساڑھے سات ہزار پاؤنڈ سے زائد کا چیک پارٹی ڈونیشن میں قبول کرلیا تھا، ادھر تحریک انصاف بھی آجکل پارٹی کی فارن فنڈنگ کا کیس بھگت رہی ہے حالانکہ یہ کام انتخابات سے قبل الیکشن کمیشن کو مکمل کرنا چاہیئے تھا سب چیزوں کی جانچ پڑتال کرکے سیاسی جماعتوں اور امیدواروں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دینی چاہیئے۔ گزشتہ انتخابات میں ہماری عقبی گلی Red Lion Road, Tolworth میں ڈیوڈ کیمرون اور اس وقت کے میئر آف لندن بورس جانسن انتخابی مہم کے سلسلے میں آئے وہ بچوں کے ایک سکول میں بھی گئے جہاں نرسری کے بچوں کے ساتھ پینٹنگ بھی کی۔ حیران کن طور پر چند فری لانس مقامی صحافیوں کے علاوہ کوئی بندہ نظر نہ آیا، علاقے کے مکینوں کو سڑک بند کرکے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی گئی کہ یہاں بگ فش کا وزٹ ہو رہا ہے۔ مشرقی لڑکی کے عموماً دو گھر ہوتے ہیں ایک میکا اور دوسرا سسرال مگر ہمارے سیاسی اکابرین نے کم از کم تین ممالک میں اپنے آشیانے بنائے ہیں۔ میاں نواز شریف کا پاکستان کے بعد دوسرا گھر سعودی عرب اور تیسرا گھر لندن ہے جہاں وہ اس وقت ''شدید بیماری'' کی حالت میں ''علاج'' کی غرض سے تشریف لائے ہیں۔ برطانیہ میں اگر دیسی میڈیا اتنا فعال نہ ہوتا تو شاید اس بات کا پتہ بھی نہ چلتا کہ میاں صاحب لندن میں ہیں کیونکہ برطانوی میڈیا نے ان کے آنے کی کوئی خاص تشہیر نہیں کی۔ اس مرتبہ میاں صاحب کو عقبی دروازے سے نکلنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آرہی کیونکہ اب گو نواز گو کا نعرہ لگانے والے اپنی دکان بڑھا چکے اور اب یہ تماشہ کرنے کی باری نون لیگ کے ''شیروں'' کی ہے۔

ویسے سیاسی کارکنوں کی یہ حرکتیں دیکھ کر برطانیہ میں مقیم دیگر افراد ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہونگے؟ برطانیہ اور امریکہ میں انتخابی مہم کا ایک حصہ یہ بھی ہوتا ہے کہ سیاسی جماعت کے قائدین براہ راست عوام کا سامنا کرتے ہیں، اپنا منشور پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ اس پر کیسے عمل کریں گے اور عوام ان سے براہ راست سوال بھی کرتی ہے یہ سب کچھ ٹی وی پر براہ راست نشر بھی ہو رہا ہوتا ہے جس کے بعد انتخابات کے لیے سیاسی جماعتوں کو پوزیشن کا سروے بھی پبلک کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے سیاسی قائدین کے درمیان غیر مہذب زبان، انتخابی مہم اور عمل میں فضول خرچیاں، میڈیا سمیت تمام اداروں کے انتہاء پسندی عروج پر نظر آتی ہے۔ ایک وقت تھا جب سیاستدان کن ٹٹے لوگوں کو استعمال کرکے لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف ڈال کر انتخابات جیتتے تھے اب کن ٹوٹے براہ راست انتخابات میں حصہ لیتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ جتنا پیسہ انتخابی مہم میں لگایا جاتا ہے اتنا پیسہ کبھی اپنے حلقے میں انتخابات جیتنے کے بعد نہیں لگایا۔ الطاف بھائی گزشتہ 27 برس سے لندن میں مقیم ہیں، عمران خان نے بھی زندگی کا بیشتر حصہ برطانیہ میں گزارہ، آصف علی زرداری کا بھی پاکستان اور دوبئ کے بعد تیسرا گھر لندن ہی ہے، پاکستان کے چار موسموں کی طرح میاں صاحبان کے لاہور، جاتی عمرہ، جدہ اور لندن چار پسندیدہ ٹھکانے ہیں، پرویز مشرف کا آشیانہ بھی لندن میں ہے اور ''علاج'' کے لیے وہ اس پاکستان کو چھوڑ آئے جسے وہ

سب سے پہلے کہتے تھے،اس کے علاوہ بھی دیگر سیاسی اکابرین کی ایک لمبی فہرست ہے جنکا مسکن اکثر لندن ہوتا ہے۔آخر کیا وجہ ہے کہ مادر جمہوریت برطانیہ سے اتنا لگاؤ ہونے کے باوجود یہاں کا آسان اور سستا انتخابی عمل اور انتخابی مہم کو وطن عزیز میں اپنانے کا نہیں سوچا جاتا۔گزشتہ دنوں فضل الرحمٰن اور ہمنوا کے دھرنے میں سیاسی جماعتوں کے جھنڈوں میں خاص بات ان کے لمبے لمبے ڈنڈے تھے جن کا استعمال کرنے سے قبل ہی دھرنا ختم ہوگیا۔کاش !ہماری سیاسی جماعتیں جھنڈوں کی بجائے ایجنڈوں پر اپنی سیاسی بصیرت صرف کرنے پر زور دیں لیکن شاید ایسا کرنے کا پاکستان کا کوئی سیاستدان سوچ بھی نہیں سکتا کہ ماضی پرست سیاستدان اپنی تہذیبی نرگسیت میں گم ہیں اور یونان کی پرانی ریاستوں اور قبائلی نظام کی طرح پرچم کو طوطم کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

sohailloun@gmail.com

23-11-2019